© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس اشاعت سے ان صفحات میں قرآن مجید کے ترجمہ و تفسیر کا ایک سلسلہ شروع ہو رہا ہے۔ ترجمہ جس نوعیت کا ہے اس کے لحاظ سے اسے ترجمہ کہنے کے بجائے ترجمانی کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔ اس میں جس چیز کی کوشش میں نے کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کو پڑھ کر جو مفہوم میری سمجھ میں آتا ہے اور جو اثر میرے قلب پر پڑتا ہے اسے حتی الامکان جوں کا توں اپنی زبان میں منتقل کر دوں، اسلوب بیان میں ترجمہ پن نہ ہو، عربی مبین میں جو کلام نازل ہوا ہے اس کی ترجمانی جہاں تک ممکن ہے اردوئے مبین میں ہو، اصل کلام کا فطری ربط آپ سے آپ ترجمہ میں نمایاں ہوتا جائے، اور کلام الٰہی کے شاہانہ وقار، زورِ بیان، اور موقع و محل کے مطابق بدلتے ہوئے لہجے اور اسلوب کو بھی جہاں تک بس چلے اردو میں منتقل کرنے کی کوشش کی جائے۔ ان اغراض کے لیے لفظی ترجمہ کی پابندیوں سے نکلنا بہرحال ناگزیر تھا، اس لیے میں نے ترجمہ کے بجائے ترجمانی کا ڈھنگ اختیار کیا، البتہ انتہائی ممکن احتیاط کے ساتھ میں نے اس امر کا التزام کیا ہے کہ اصل عبارت کے الفاظ جس قدر مفہوم کے متحمل ہوں اس سے تجاوز نہ ہونے پائے۔ پھر مجرد ترجمانی سے ایک عام ناظر کے فہمِ قرآن میں جو کمی باقی رہ جاتی ہے اُسے پورا کرنے کے لیے میں نے مختصر تفسیری حواشی اور ہر سورت کے آغاز میں ایک مختصر مقدمہ کا اضافہ کیا ہے، اور ان میں ایک اوسط درجہ کے تعلیم یافتہ آدمی کی ضروریات کو پیشِ نظر رکھ کر صرف وہ باتیں بیان کر دی ہیں جن کا جاننا قرآن کے معنی و مدعا کو اچھی طرح سمجھنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لیے ضروری ہے۔ اسی مناسبت سے میں نے اس کا نام "تفہیم القرآن" رکھا ہے کیونکہ اس سلسلہ کو شروع کرنے سے میرا مقصد عام لوگوں کو قرآن سمجھانا ہے۔

قرآن کے بارے میں کوئی بڑے سے بڑا عالم بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ اس کے پورے علم پر حاوی ہو گیا ہے، پھر بھلا مجھ جیسے ایک قلیل البضاعت شخص کے لیے یہ کس طرح جائز ہو سکتا ہے کہ وہ تنہا اپنے بل بوتے پر اس کتاب عظیم کی ترجمانی کر کے اسے ایک مختتم چیز کی حیثیت سے دنیا کے آگے پیش کر دے۔ اس لیے میں کتابی صورت میں اس کی اشاعت سے پہلے تنقید و مشورہ کے لیے اسے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ رسالہ میں اس کی اشاعت کا سلسلہ شروع کرنے سے میری غرض یہی ہے کہ اہل علم و نظر حضرات بالخصوص اور عام ناظرین بالعموم اسے تنقیدی نظر سے ملاحظہ کریں اور جہاں کوئی غلطی یا فروگذاشت، یا ترجمانی و تفسیر میں کوئی تشنگی، یا کسی اعتراض و شبہ کی گنجائش پائیں ازراہ کرم مجھے اس پر متنبہ فرما دیں تاکہ نظر ثانی کے وقت میں ان کے مشوروں سے استفادہ کر کے اس چیز کو زیادہ سے زیادہ صحیح و معتبر اور مفید بنا سکوں۔ سردست اس سلسلہ کو آخری تیار شدہ چیز نہ سمجھا جائے بلکہ محض ایک مسودہ کی حیثیت سے دیکھا جائے۔ برادران دینی سے میری درخواست ہے کہ وہ اس خدمت کی تکمیل میں میری مدد فرمائیں۔ جو اصحاب بھی اس میں میری اعانت کریں گے میں ان کا شکر گذار ہوں گا اور اگر کچھ لوگ ہمدردانہ مشورہ و اصلاح کی جگہ طعن و تعریض کا طریقہ اختیار کرنا پسند فرمائیں تو ان کے ارشادات میں بھی جہاں کوئی بجا اعتراض دیکھوں گا اس سے استفادہ کرنے اور ان کی عنایت کا شکریہ ادا کرنے میں انشاءاللہ مجھے تامل نہ ہوگا۔

جہاں تک ترجمۂ قرآن کا تعلق ہے، یہ خدمت بہترین طریقہ پر اس سے پہلے متعدد بزرگ انجام دے چکے ہیں اور اس راہ میں اب کسی مزید کوشش کی ضرورت بظاہر نظر نہیں آتی۔ فارسی میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب اور اردو میں شاہ عبدالقادر صاحب، شاہ رفیع الدین صاحب، مولانا محمود الحسن صاحب، مولانا اشرف علی صاحب اور بعض دوسرے حضرات کے تراجم اس غرض کے لیے بالکل کافی ہیں کہ ایک شخص ان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ذریعہ سے کلام اللہ کا لفظی مفہوم ٹھیک معلوم کرلے۔

یہ ترجمے بجائے خود اپنا ایک فائدہ، اور عظیم فائدہ رکھتے ہیں۔ پابندیٔ الفاظ کے ساتھ صحیح ترجمہ کی ضرورت بہرحال ہے اور باقی رہے گی۔ اس سے جو فائدہ وابستہ ہے وہ کسی دوسرے طریقہ سے حاصل نہیں کیا جاسکتا۔ لہٰذا اس ترجمانی سے میرا یہ مدعا بھی نہیں ہے کہ لوگوں کو لفظی ترجموں سے بے نیاز کر دیا جائے حتی کہ ان سے استفادہ کرنے کی ضرورت ہی باقی نہ رہے۔

دراصل جو کچھ میرے پیش نظر ہے وہ صرف یہ ہے کہ فہم قرآن کے سلسلہ میں بعض اہم ضرورتیں جو لفظی ترجموں سے پوری نہیں ہوتیں اور نہیں ہوسکتیں انہیں اس ترجمانی کے ذریعہ سے پورا کیا جائے۔ الفاظ کی پابندی کے ساتھ جو ترجمے کیے گئے ہیں ان کا اصل فائدہ یہ ہے کہ ناظر کو ہر آیت کے مقابلہ میں اس کے لفظ لفظ کا مفہوم معلوم ہو جاتا ہے اور کم و بیش آیت کا مطلب بھی سمجھ میں آجاتا ہے، لیکن اس فائدہ کے ساتھ چند پہلو نقصان کے بھی ہیں جن کی کسر پوری کرنا پابندیٔ الفاظ کے ساتھ ممکن نہیں ہے اور اس غرض کے لیے بہرحال ایک دوسری نوعیت کی کوشش ناگزیر ہے۔

سب سے پہلی چیز جو ایک لفظی ترجمہ کو پڑھتے وقت محسوس ہوتی ہے وہ روانیٔ عبارت، زور بیان، بلاغتِ زبان اور تاثیرِ کلام کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ترجمہ پڑھنے اور سننے والے کی روح کبھی وجد میں نہیں آتی، اس کے رونگٹے کھڑے نہیں ہوتے، اس کی آنکھوں سے آنسو جاری نہیں ہوتے، اس کے جذبات میں طوفان برپا نہیں ہوتا اور اُسے یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی چیز عقل و فکر کی قوتوں کو مسخر و مفتوح کرتی ہوئی تیر کی طرح دل و جگر تک پیوست ہوتی چلی جارہی ہے۔ وہ قرآن کی سطروں کے نیچے ایک ایسی بے جان عبارت دیکھتا ہے جو لفظی ترجمہ کی چھلنی سے گذرنے کے بعد محض دوا کے خشک اجزا ہی لیے ہوئے نکلتی ہے اور ادب کی وہ تیز و تند اسپرٹ اس میں سے بالکل اُڑ جاتی ہے جس کے اندر دوا کو اس لیے حل کیا گیا تھا کہ وہ اُسے لے کر قلب و روح کی گہرائیوں تک پہنچ جائے۔ غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ کمی کوئی معمولی کمی نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قرآن کی تاثیر میں اس کی بلند تعلیم اور اس کے عالی قدر مضامین کا جتنا حصہ ہے اس کے زورِ بیان کا حصہ اس سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہی تو وہ چیز ہے جو سنگ دل سے سنگ دل آدمی کا دل پگھلا دیتی تھی، جس نے بجلی کے کڑکے کی طرح اِدھر سے اُدھر تک تمام سرزمینِ عرب کو ہلا دیا تھا، جس کی قوتِ تسخیر کا لوہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے شدید ترین مخالف تک مانتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ لوگ اس کلام کو نہ سنیں کیونکہ اس کی جادو بیانی سے انھیں ڈر لگتا تھا کہ جو اسے سنے گا وہ بالآخر اس کے آگے نقدِ دل ہار بیٹھے گا۔ یہ چیز اگر قرآن میں نہ ہوتی، اگر وہ اسی طرز کی زبان میں نازل ہوا ہوتا جو ہمیں اس کے ترجموں میں نظر آتی ہے تو یقیناً اسے اہلِ عرب کے دلوں کو گرمانے اور نرمانے میں وہ کامیابی حاصل نہ ہوتی جو فی الواقع حاصل ہوئی۔

اس میں شک نہیں کہ قرآن کی بلاغت اعجازی بلاغت ہے اور کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ اس کے معانی و مطالب کو اسی شان کے ساتھ اپنی زبان میں ادا کر سکے جس کے ساتھ وہ قرآن میں ادا کیے گئے ہیں۔ لیکن جہاں تک ہمارے بس میں ہے، ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ اس کی ترجمانی ایسے طرز سے کریں جو دلوں میں نفوذ کرنے والا ہو۔ اس کے بغیر وہ فوائد حاصل نہیں ہو سکتے جو قرآن کے مطالب کو کسی دوسری زبان میں نقل کرنے سے مقصود ہیں۔

قرآن کے تراجم سے طبائع کے پوری طرح متاثر نہ ہو سکنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ترجمے بالعموم بین السطور درج کیے جاتے ہیں، یا نئے طرز کے مطابق صفحے کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک طرف کلام اللہ کی عبارت ہوتی ہے اور اس کے بالمقابل ترجمہ لکھا جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ لفظی ترجمہ کے لیے یہ طریقہ ضروری اور عین مناسب ہے کیونکہ اس کی غرض ہی یہ ہے کہ تلاوت کے ساتھ ساتھ آدمی یہ بھی معلوم کرتا جائے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے اس کا مطلب کیا ہے۔ لیکن اس میں جہاں فائدہ کا یہ پہلو ہے وہیں نقصان کا بھی ایک پہلو ہے، اور وہ یہ ہے کہ پڑھنے والا ترجمہ کی عبارت کو اس طرح پوری توجہ کے ساتھ مسلسل نہیں پڑھ سکتا جس طرح وہ دوسری کتابوں کو پڑھتا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس آسانی کے ساتھ وہ دوسری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کتابوں کے مطالعہ سے اثر قبول کرتا ہے وہ آسانی اُسے ترجمۂ قرآن سے اثر لینے میں محسوس نہیں ہوتی کیونکہ ایک اجنبی زبان کی عبارتیں بار بار اس کے مطالعہ کی راہ میں حائل ہوتی رہتی ہیں۔ انگریزی ترجموں میں اس سے بھی زیادہ بے اثری پیدا کرنے کا ایک سبب یہ ہے کہ بائیبل کے ترجمہ کی پیروی میں قرآن کی ہر آیت کا ترجمہ الگ الگ نمبروار درج کیا جاتا ہے۔ آپ کسی بہتر سے بہتر مضمون کو لے کر ذرا اس کے فقرے فقرے کو الگ کر دیجیے اور مربوط عبارت کی شکل میں رکھنے کے بجائے انھیں اوپر نیچے نمبروار لکھتے جائیے، پھر اسے پڑھ کر دیکھیے، آپ کو خود محسوس ہو جائے گا کہ مربوط اور مسلسل عبارت سے جو اثر آپ کے ذہن پر پڑتا تھا اس سے آدھا اثر بھی ان جدا جدا فقروں کے مطالعہ سے نہیں پڑتا۔

اس نقصان کی تلافی کے لیے مناسب صورت یہی ہو سکتی ہے کہ لفظی ترجمہ بدستور اسی طرح پیش کیا جائے جس طرح اب تک کیا جاتا رہا ہے، مگر اس کے ساتھ انہی مطالب کی ترجمانی ایک مسلسل عبارت کی شکل میں بھی ہو تاکہ لفظ لفظ اور آیت آیت کا ترجمہ معلوم کر لینے کے بعد آدمی اس ترجمانی کو بالکل اسی طرح پڑھ سکے جس طرح وہ کسی کتاب کو پڑھا کرتا ہے۔ "تفہیم القرآن" کو کتابی صورت میں شائع کرنے کی نوبت جب آئے گی تو انشاء اللہ قرآن مجید کی اصل عبارت معہ ترجمۂ شاہ عبدالقادر صاحب اس کے ساتھ شامل کر دی جائے گی تاکہ بیک وقت دونوں فائدے حاصل کیے جا سکیں۔

قرآن کے لفظی ترجمہ میں نقص کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں کلام کا ربط اچھی طرح واضح نہیں ہوتا بلکہ اکثر مقامات پر بے ربطی اتنی نمایاں ہو جاتی ہے کہ پڑھنے والے کو سخت الجھن ہونے لگتی ہے۔ اہل ایمان تو یہ خیال کر کے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہیں کہ یہ کلام نجماً نجماً نازل ہوا ہے لہٰذا ایک آیت کا دوسری آیت سے اور ایک بیان کا دوسرے بیان سے تعلق ہونا ضروری نہیں ہے۔ لیکن جو لوگ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا عقیدہ نہیں رکھتے اُن پر کلام کا یہ رنگ دیکھ کر اُلٹا اثر پڑتا ہے، کیونکہ خدا تو درکنار، معمولی انسان کے کلام میں بھی اگر بے ربطی پائی جائے تو سننے اور پڑھنے والے پر کبھی اچھا اثر نہیں پڑ سکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نقص کو لفظی ترجمہ سے دُور کرنا کسی طرح ممکن نہیں ہے۔ اور ربط کلام کو مصنوعی طریقہ سے بیان کرنے کی جو کوششیں کی گئی ہیں اور کی جارہی ہیں وہ اس سے بھی زیادہ غیر مفید ہیں، کیونکہ ان کو دیکھ کر تو صریح طور پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے اللہ میاں کی بات بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دراصل ربط کلام اور صرف ربط ہی نہیں بلکہ کلام کی روح کو بھی پوری طرح واضح کرنے کے لیے تین باتوں کا لحاظ کرنا ضروری ہے جن کی طرف ہم یہاں مختصر طور پر اشارہ کریں گے۔

پہلی چیز جسے نظر میں رکھنا نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کا طرزِ بیان تحریری نہیں بلکہ تقریری ہے۔ اللہ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یہ کلام لکھے ہوئے رسالوں کی شکل میں نہیں آتا تھا بلکہ فرشتہ آکر دُوبدُو زبانی پیغام ادا کرتا تھا۔ اور اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان پیغامات کو مضامین اور رسالوں کی صورت میں شائع نہیں فرماتے تھے بلکہ زبانی خطبوں کی صورت میں بیان کرتے تھے۔ تحریر کی زبان اور تقریر کی زبان میں فطری طور پر بہت فرق ہوتا ہے۔ مثلاً تحریر میں ایک شبہ کو بیان کرکے اسے رفع کیا جاتا ہے مگر تقریر میں شبہ کرنے والے خود سامنے موجود ہوتے ہیں اس لیے ان کے شبہ کو نقل کرنے کے بجائے سلسلۂ کلام ہی میں ان کو جواب دے دیا جاتا ہے۔ تحریر میں سلسلۂ کلام سے الگ مگر اس سے قریبی تعلق رکھنے والی کوئی بات بیان کرنی ہو تو اس کو جملۂ معترضہ کے طور پر نمایاں علامات کے ساتھ لکھا جاتا ہے تاکہ ربط ٹوٹنے نہ پائے لیکن تقریر میں صرف لہجہ اور طرزِ خطاب کا تغیر ایک جملۂ معترضہ کو سلسلۂ کلام سے بآسانی الگ کردیتا ہے۔ تحریر میں بیان کا تعلق ماحول سے جوڑنے کے لیے الفاظ سے کام لینا پڑتا ہے، لیکن تقریر میں ماحول خود ہی بیان سے اپنا تعلق جوڑ لیتا ہے اور ماحول کی طرف اشارہ کیے بغیر جو باتیں کہی جاتی ہیں ان کے درمیان کوئی خلا محسوس نہیں ہوتا کیونکہ اس خلا کو تو ماحول خود ہی بھر رہا ہوتا ہے۔ اب اگر آپ کو کسی تقریری بیان کی ترجمانی تحریر کی صورت میں کرنی ہو تو آپ کے لیے ناگزیر ہے کہ کلام کے الفاظ کی پابندی سے ذرا آزاد ہو کر تحریر و تقریر کے مندرجہ بالا فرق کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے، بیان میں اس حد تک تغیر و تبدل کردیں جس حد تک

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس تقریر کو تحریر کی شکل میں ڈھالنے کے لیے فطرۃً ضروری ہے۔ اور اگر اس سے بھی کام نہ چلے تو حاشیہ سے مدد لے کر اس خلا کو پُر کریں۔ ورنہ اسے جوں کا توں پیش کر دینا پڑھنے والے کے لیے لامحالہ اُلجھن کا موجب ہوگا۔

مثال کے طور پر دیکھیے، سورۂ بقرہ کے تیسرے رکوع میں قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا ثبوت پیش کرنے کے بعد ان لوگوں کے انجام کا فرق بتایا گیا ہے جو اس کتاب پر ایمان لائیں اور جو اس کا انکار کر دیں۔ پھر یکایک ارشاد ہوتا ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا (اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بھی حقیر تر کسی چیز کی مثال دے)۔ یہاں منکرینِ قرآن کے ایک شبہ کو نقل کیے بغیر اس کا جواب دیا گیا ہے۔ تقریر میں اس سے کوئی بے ربطی پیدا نہیں ہوتی۔ لیکن اگر تحریر میں اس جواب کو کسی نمایاں علامت کے ساتھ اوپر کے سلسلۂ کلام سے ممیز نہ کیا جائے اور اس شبہ کی کسی طور پر تصریح نہ کر دی جائے جس کا جواب اس جملہ میں دیا گیا ہے تو پڑھنے والا ضرور بے ربطی محسوس کرے گا۔

یا مثلاً سورۂ قیامہ کو دیکھیے۔ بعث بعد الموت کا اثبات اور منکرینِ حشر کو تنبیہ کرتے کرتے یکایک نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے ارشاد ہوتا ہے لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ، اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ، فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ، ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ (اسے یاد کرنے کی فکر میں جلدی جلدی اپنی زبان کو حرکت نہ دو، ہم ذمہ لیتے ہیں کہ اس مضمون کو جمع کر کے تمھیں پڑھ کر سنا دیں گے، اُس وقت جب ہم پڑھیں تو تم بھی ہمارے ساتھ ساتھ پڑھتے جانا، پھر اس کی تشریح کر دینا بھی ہمارے ذمہ ہے)۔ اس کے بعد كَلَّا بَلْ تُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ سے پھر وہی سلسلۂ تقریر شروع ہو جاتا ہے جو وَلَوْ اَلْقٰى مَعَاذِيْرَهٗ پر ٹوٹا تھا۔ یہاں اگر ان جملہ ہائے معترضہ کو، جو تقریر کے درمیان آگئے ہیں، سیاقِ عبارت سے ممیز نہ کیا جائے اور یہ تصریح نہ کر دی جائے کہ نزولِ وحی کے دوران میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے الفاظ یاد کرنے کی کوشش کرتے دیکھ کر یہ جملے بطور فہمائش کے ارشاد ہوئے ہیں اور رسولِ امین نے ان کو بھی جوں کا توں نقل کر دیا ہے تو یقیناً وسطِ کلام میں چند بظاہر بالکل غیر متعلق جملے دیکھ کر ناظر کا ذہن اُلجھے بغیر نہ رہ سکے گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا مثلاً سورۂ آل عمران میں تیرھویں رکوع سے اٹھارویں رکوع تک جنگ اُحد پر جو مسلسل تبصرہ کیا گیا ہے اُسے پڑھیے۔ یہاں طرزِ بیان یہ ہے کہ ایک ایک دو دو فقروں میں جنگ کے مختلف اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے، منافقین، کفار، ضعیف الایمان لوگ، مومنین مخلصین، نبی صلی اللہ علیہ وسلم، اور بحیثیت مجموعی مسلم جماعت سب زیرِ بحث آئے ہیں۔ خطاب کبھی کسی کی طرف پھرتا ہے تو کبھی کسی کی طرف۔ جگہ جگہ ایسے امور کی طرف اشارے آتے ہیں جو صراحت کے ساتھ مذکور نہیں ہیں۔ یہ پورا خطبہ اُس ماحول میں بالکل مربوط تھا جس میں یہ ارشاد فرمایا گیا تھا، کیونکہ اس کے مختلف فقروں کے درمیانی خلا کو خود ماحول پُر کر رہا تھا اور الفاظ سے اُس خلا کو پُر کرنا نہ صرف بے محل اور لا حاصل تھا بلکہ اگر ایسا کیا جاتا تو یہ شاہانہ تبصرہ کے بجائے وقائع نگار کا تاریخی بیان بن جاتا۔ لیکن اب اس کا لفظ بلفظ ترجمہ جو شخص تحریر کی صورت میں پڑھے گا اسے پورا کلام غیر مربوط نظر آئے گا۔ اس کی صحیح ترجمانی کے لیے اب یہ ناگزیر ہے کہ مستند روایات کی مدد سے ترجمان خود اس ماحول کو اپنے سامنے حاضر کرے اور اس کی تفصیلات کو پیش نظر رکھ کر آیات کے درمیانی خلا کو اس طرح بھرتا جائے کہ شاہانہ تبصرہ کی شان میں فرق نہ آئے۔

دوسری اہم چیز جسے ملحوظ رکھنا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے بکثرت مقامات اپنے پس منظر سے نہایت گہرا تعلق رکھتے ہیں اور کلام کی پوری ترکیب اس پس منظر کے ساتھ کچھ اس طرح مربوط ہے کہ اگر اس سے الگ کر کے محض کلام کے الفاظ کو دیکھا جائے تو ساری تقریر بے ربط سی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ایسے مواقع پر جب تک ہم لفظی ترجمہ کی حدود سے نکل کر کلام کا تعلق ٹھیک ٹھیک اس کے پس منظر کے ساتھ جوڑ نہ دیں، ہم کسی طرح اُس بے ربطی کو دور نہیں کر سکتے جو مجرد ترجمۂ الفاظ پیش کرنے کی صورت میں بظاہر نظر آتی ہے۔

اس کی توضیح کے لیے ہم سورۂ غاشیہ کو مثال میں پیش کریں گے۔ یہ سورۃ بغیر کسی تمہید کے اچانک اس سوال سے شروع ہوتی ہے کہ "تمہیں اُس چھا جانے والی آفت کی بھی کچھ خبر ہے؟" پھر اس آفت کے دن کی مختصر کیفیت بیان کی جاتی ہے کہ اس میں ایک گروہ ایسی اور ایسی تکلیفوں میں مبتلا ہوگا اور دوسرا گروہ اس طرح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عیش کرے گا۔ اس کے بعد یکلخت کلام کا رُخ بدلتا ہے اور پے در پے چار سوالات کیے جاتے ہیں" یہ لوگ اونٹ کو نہیں دیکھتے کیسا بنایا گیا ہے؟ آسمان کو نہیں دیکھتے کیسا بلند کیا گیا ہے؟ پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کیسے جمائے گئے ہیں؟ زمین کو نہیں دیکھتے کیسی پھیلائی گئی ہے؟" پھر یہ سلسلۂ کلام بھی صرف انہی سوالات پر ختم ہو جاتا ہے اور کسی مزید گفتگو کے بغیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا جاتا ہے کہ" خیر، تم نصیحت کیے جاؤ، تم محض نصیحت کرنے والے ہو، ان پر کوتوال نہیں ہو....."۔ اب اگر اس سورۃ کا لفظی ترجمہ کوئی دیکھے تو اسے پورے مضمون میں تین مختلف مضمون نظر آئیں گے جن کا باہمی ربط سمجھنا اس کے لیے مشکل ہوگا۔ لیکن اگر اسی مضمون کو اس کے پس منظر کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے تو یہ نہایت برمحل، متناسب اور مرتب کلام معلوم ہوگا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ اللہ کے نبی کو توحید اور بندگیِ رب کی طرف دعوت دیتے ہوئے کافی مدت گذر چکی ہے، اس نے ہر ممکن طریقِ استدلال سے لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ شرک خلافِ حقیقت ہے اور نظامِ کائنات ایک ہی الٰہ اور ایک ہی رب کے زیرِ حکم ہے، وہ اپنی قوم کو اوہام کی پیروی سے روکنے اور حقیقت کے اتباع کی طرف لانے کی ان تھک جدوجہد کرتا رہا ہے، مگر لوگ کچھ اس طرح دنیا کی زندگی میں مستغرق اور آخرت کے نتائج سے غافل ہیں کہ اس کی کوئی نصیحت ان پر اثر نہیں کرتی اور ان کی یہ حالت دیکھ کر اس کا دل ٹوٹا جا رہا ہے۔ اس صورتِ حال میں اوپر سے پیغام آتا ہے کہ تمہیں اُس وقت کی بھی کچھ خبر ہے جب ایک عالمگیر آفت تمام جہان کو اپنی لپیٹ میں لے لے گی اور سعید و شقی کا انجام صاف کھل جائے گا۔ آج جو چہرے خدا سے بے خوف، دنیا کی زندگی میں مگن نظر آتے ہیں، اس وقت یہی چہرے اُترے ہوئے ہوں گے اور سخت مصیبت کی زندگی ان کو تھکا مارے گی۔ اور آج جن چہروں پر خدا ترسی چھائی ہوئی ہے، یہی چہرے اس وقت تر و تازہ اور عیش جاودانی میں مگن ہوں گے۔ اس طرح چونکا دینے والے انداز میں آنے والی گھڑی کی اچانک خبر دے کر فرمایا جاتا ہے کیا یہ لوگ اندھے ہیں؟ اونٹ، آسمان، پہاڑ، زمین، سب کچھ رات دن دیکھتے ہیں، اور پھر بھی ان چیزوں کی ساخت اور ان کے نظام کار میں انھیں اُس تعلیم کی صداقت کا ثبوت نظر نہیں آتا جو تم دے رہے ہو؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اللہ کی یہ آیات جو ان کی آنکھوں کے سامنے موجود ہیں، کیا یہ وحدت الوہیت و ربوبیت کی شہادت دینے کے لیے کافی نہیں ہیں؟ پھر اپنے نبی سے ارشاد ہوتا ہے کہ اچھا، یہ نہیں دیکھتے تو نہ دیکھیں، تم اپنا فرض ادا کیے جاؤ، تمہارا کام سمجھانا ہے، کوئی نہ سمجھے تو اس کے اندر زبردستی ایمان اتار دینا تمہارا کام نہیں ہے۔ جو نہ مانے گا اور تمہاری پیروی سے منہ موڑے گا وہ پلٹ کر تو بہرحال ہمارے ہی پاس آئے گا، پھر ہم خود اس کا حساب چکا دیں گے۔

دیکھیے، اس پس منظر میں سورہ کا مضمون کس طرح چمک اُٹھتا ہے اور اس روشنی میں سورۃ کی تمہید، مرکزی تقریر اور خاتمہ کے درمیان کس قدر نفیس اور کتنا محکم ربط نظر آنے لگتا ہے۔

تیسری چیز جو اس سلسلہ میں بڑی اہمیت رکھتی ہے وہ قرآن کی مخصوص اصطلاحی زبان کی رعایت ہے۔ قرآن کے بکثرت الفاظ اپنے لغوی مفہوم سے بہت زیادہ وسیع معنویت اپنے اندر رکھتے ہیں اور ان میں یہ معنویت قرآن کے انداز بیان اور طریق استعمال سے پیدا ہوئی ہے۔ ان الفاظ کے معانی میں وسعت پیدا کرنے کے بعد قرآن نے ان کو مختلف مواقع پر مختلف ضمنی مفہومات میں استعمال کیا ہے اور یہ بات سیاق و سباق پر غور کرنے سے معلوم ہوتی ہے کہ ایک لفظ کے ضمنی مفہومات میں سے کس مقام پر کونسا مفہوم مراد ہے۔ لفظی ترجمہ کے التزام کی صورت میں اس کے سوا چارہ نہیں کہ لفظ کو یا تو جوں کا توں رکھ دیا جائے، یا لغت کے اعتبار سے اس کا جو ترجمہ ہو سکتا ہو وہی درج کیا جائے، لیکن اس سے نہ صرف یہ کہ معانی قرآن کی وہ وسعتیں اور نزاکتیں پوری طرح سامنے نہیں آتیں جو ان اصطلاحی الفاظ میں مضمر ہیں، بلکہ اکثر مقامات پر ترجمہ پڑھنے والے کو سیاق عبارت میں ایک بے محل لفظ دیکھ کر سخت الجھنوں اور غلط فہمیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ کفر ہی کو لے لیجیے جسے قرآن نے عدم ایمان کی بہت سی مختلف حالتوں کے لیے ایک ہی جامع اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ کہیں اس سے مراد مکمل غیر ایمانی حالت ہے، کہیں یہ مجرد انکار کے معنی میں آیا ہے، کہیں اس سے محض ناشکری و احسان فراموشی مراد لی گئی ہے، کہیں مقتضیات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ایمان میں سے ایک یا چند کو پورا نہ کرنا مراد ہے، کہیں اعتقادی اقرار مگر عملی انکار یا نافرمانی کے لیے یہ لفظ بولا گیا ہے، کہیں ظاہری اطاعت مگر باطنی بے اعتقادی پر اس کا اطلاق ہوا ہے، اور کہیں کفر کا لفظ عام کافرانہ طرزِ عمل کے بجائے کسی خاص چیز کے نہ ماننے کے لیے استعمال کیا گیا ہے جو قریب ہی سیاق عبارت میں کسی جگہ مذکور ہوتی ہے۔ اب اگر ہم ہر جگہ ترجمہ میں کفر کا لفظ جوں کا توں لکھ دیں، یا کسی ایک لفظ مثلاً انکار وغیرہ کو اس کے ترجمہ کے طور پر لکھتے چلے جائیں، تو بلاشبہ ترجمہ اپنی جگہ صحیح ہوگا، لیکن اول تو ناظرین پر مطلب پوری طرح واضح نہ ہو سکے گا اور مزید براں بعض مواقع پر سلسلۂ کلام میں اس لفظ کی مناسبت بھی لوگوں کی سمجھ میں نہ آسکے گی۔ پس قرآنی مطالب کی تفہیم اور ربطِ عبارت کی توضیح کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ ایسے وسیع المعنی اصطلاحی الفاظ کا ترجمہ کرنے کے بجائے اس امر کی کوشش کی جائے کہ ہر جگہ موقع و محل کے لحاظ سے ان کا مفہوم ادا کیا جائے اور جن اصطلاحات کی تعبیر کسی ایسے طریقہ سے ممکن نہ ہو کہ ترجمانی کا حُسن اور کلام کی فصاحت برقرار رکھی جا سکے، ان کو بعینہٖ نقل کر کے دوسرے طریقوں سے تفہیم کی سعی کی جائے۔

ان امور کے ذکر سے میرا مقصد لفظی ترجمہ کی اہمیت گھٹانا نہیں ہے بلکہ اللہ کے بندوں تک اللہ کے کلام کی تعلیمات پہنچانے میں جو کسر ابھی باقی ہے اس کی اہمیت واضح کرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بزرگوں نے اردو زبان میں مختصر و مفصل تفسیریں لکھ کر یہ کسر پوری کرنے کی کوشش کی ہے، اور حال میں ترجمانی کے طرز پر بھی بعض کوششیں کی گئی ہیں، لیکن ان مساعی کو عزت و وقعت کے ساتھ دیکھنے کے باوجود میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ عام غیر عربی داں ناظرین، بلکہ بہت سے عربی داں ناظرین کی بھی بعض ضروریات ابھی ایسی رہ جاتی ہیں جو ان سے پوری نہیں ہوتیں۔ یہ احساس مجھے ایک مدت سے تھا، مگر اپنی بے بضاعتی اور اس کام کی عظمت و نزاکت کو دیکھ کر ہمت نہ پڑتی تھی۔ میں دعا کرتا رہا کہ کوئی مجھ سے بہتر شخص بلکہ بالغ النظر اشخاص کا ایک گروہ اس خدمت کی طرف توجہ کرے، لیکن جہاں تک مجھے علم ہے ابھی تک کہیں اس خاص پہلو سے قرآن کی خدمت انجام دینے کا خیال پیدا نہیں ہوا ہے۔ دوسری طرف میں دیکھ رہا ہوں کہ قرآن کے علم کو اس طریقہ سے پیش کرنے کی ضرورت بڑھتی اور شدید تر ہوتی چلی جا رہی ہے۔ آخر کار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

محض اللہ کے بھروسہ پر میں نے ایک نہایت نازک وقت میں اس کام کا عزم کیا ہے جب اس کام کو دیکھتا ہوں تو ترجمہ و تفسیر دونوں کی بہ نسبت ترجمانی کی ذمہ داری زیادہ سخت نظر آتی ہے کیونکہ اس میں ہر آن یہ خطرہ ہے کہ کلامِ الٰہی کی غلط تعبیر کرکے آدمی اجر کے بجائے کہیں اُلٹا وزر نہ مول لے لے جب اپنے آپ کو تولتا ہوں تو اس بھاری ذمہ داری کے مقابلہ میں بہت ہلکا پاتا ہوں جب گرد و پیش کے حالات پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک بر سرِ انحطاط اور اخلاقی حیثیت سے گری ہوئی قوم میں، جو فتنوں کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے، جسے فتنہ کہیں نہ ملے تو کوشش کرکے اسے خود پیدا کرتی ہے، جس کی کج نگاہی و کج خوئی اتنی بڑھ چکی ہے کہ راستی میں بھی کجی ہی ڈھونڈتی ہو، ایسا کوئی اقدام کرنا گویا جنگل کے تمام کانٹوں کو اُلجھنے کی دعوت دینا ہے۔ مگر جب اس طرف نگاہ جاتی ہے کہ ہدایت کے پیاسے بندوں تک کلام اللہ کا فیض پہنچانے کے لیے اس نوعیت کی ایک کوشش بالکل ناگزیر ہو چکی ہے اور تبلیغ دین کی راہ میں اس سے مدد لینے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے تو میرا ضمیر فیصلہ کرتا ہے کہ جو کچھ تو خود کر سکتا ہے اس کے کرنے میں ہرگز دریغ نہ کر اور جو کچھ تیری مقدرت سے بالاتر ہے اس کے لیے اللہ کی مدد پر بھروسہ کر، وہی نورِ علم دینے والا ہے، وہی مشکلیں آسان کرنے والا ہے، وہی کامیابی کے اسباب فراہم کرنے والا ہے، وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ۔

از روئے قاعدہ مارچ میں جماعتِ اسلامی کا اجتماعِ عام منعقد ہونا چاہیے تھا۔ لیکن جنگ کی وجہ سے جو اضطرابی حالات ملک میں پیدا ہو چکے ہیں ان کی وجہ سے یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس وقت اجتماعِ عام کو ملتوی کرکے صرف اہلِ حل و عقد کی مجلسِ شوریٰ منعقد کر لی جائے۔ چنانچہ فروری کے آخری ہفتہ میں مجلس منعقد ہوئی جن جن حضرات کو دعوت دی گئی تھی، الحمدللہ کہ وہ سب تشریف لے آئے تھے۔ صرف جنوبی ہند کے ارکانِ شوریٰ قلتِ وقت اور بُعدِ مقام کی وجہ سے نہ پہنچ سکے۔ جملہ شرکاء کی تعداد ۱۶ تھی۔ جن امور پر غور کیا گیا وہ حسبِ ذیل تھے؛

(۱) تشکیل جماعت کے بعد سے اب تک جس قدر کام ہوا ہے اس پر جملہ پہلوؤں سے تنقید۔

© rasailojaraid.com